تعلیماتِ تصوف اور فکرِ رومی

* عبدالوہاب جان

ABSTRACT

MaulanaJalaal-ud-DiyynRuomiihas compiled the teachings of Sufism in his famous book "Mattanavii". According to him, Sufism is to achieve the acquaintance of ALMIGHTY ALLAH by following Islamic Law and spiritual Path (Shari'at o tareeqat). The motivation to achieve peace of heart and struggle for it is compulsory. He also urged to forget the differences & to live with love and peace being a unit. In this paper the above mentioned sufism's teaching discussed in the light of Mattanaviiby MaulanaRuomii.

Keywords: Mattanavii, Sufism, MaulanaRuomii.

فاتحہ:

تصوف کی تعلیمات کو اشعار کی زبان میں پیش کرنے والا، بلخ کا رہنے والا، نابغہ روزگار، مولانا جلال الدین رومیؒ آٹھ سو سال گزرنے کے باوجود شرق و غرب میں آفاقی نظریات و تصورات کی بدولت زندہ و پائندہ ہے۔ چھبیس ہزار چھ سو چھیاسٹھ (۲۶۶۶۶) اشعار پر مشتمل ان کی مشہورِ زمانہ "مثنوی" تصوف، عشق اور معرفت الٰہی کے جملہ نکات کا مرصّع اور مرقع ہے۔ مثنوی کی شکل میں مولانا روم نے تصوف کی بے پناہ خدمت کی ہے، مولانا نفس انسانی کی تہذیب و اصلاح کو تصوف کا اصل قرار دیتے ہیں۔ اور عارف رومی کے نزدیک حقیقی عرفان اپنی خودی کی پہچان ہے، اسی پہچان سے خدا اور آفاق کی پہچان ہو سکتی ہے۔ اس پہچان کا مقصود خدا کا قرب و وصال ہے اور وصال کے لیے قرب کی کوشش اور کشش کا نام عشق ہے۔ شریعت و طریقت کی راہ پر رومیؒ طلب و عمل کا پیغامبر ہے۔

رومی کا دور

عارف رومیؒ نے اسلام کے سات سو سالہ دور میں چوتھی صدی ہجری کے بعد تصوف کی جس شکل کو پروان چڑھتے مشاہدہ کیا وہ تصوف کا مابعد الطبعیاتی پہلو تھا جس میں خدا اور کائنات کی حقیقت و ماہیت پر گنجلک مضامین شامل تھے۔ تصوف کا یہ پہلو در حقیقت فلسفیانہ چہ میگوئیوں اور کلامی موشگافیوں کا مرقع تھا، یوں تصوف اپنی اصلیت سے معدول ایک پیچیدہ اور پُر اسرار اصطلاح کے طور پر متعارف ہونے لگا۔

---

* اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ عقیدہ و فلسفہ، کلیہ اصول الدین، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

تاریخ موصولہ: ۲۰۱۶/۱۰/۱۸ء برقی پتا: abdulwahab.jan@iiu.edu.pk

عارف رومیؒ نے تصوف کے صحیح تعارف کے لیے اور زمانے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کے ازالہ کے لیے غیر مستند روایتوں کی تردید کی اور اصطلاحات تصوف کی صحیح تعبیر و وضاحت فرمائی جنکے سہارے نام نہاد صوفیوں نے اسلام کو ایک جامد اور غیر متحرک دین کے طور پر پیش کر رکھا تھا، وہ کسی طور پر فنافی الذات کے اس تصور کے حامی نہ تھے جو ذات کو ذاتِ خدا سے بے بہرہ بنادے بلکہ پورے شعور کے ساتھ احکاماتِ خداوندی پر عمل کے ذریعے ذات کے اعلیٰ امکانات کو فروغ دینے پر توجہ کو فنافی الذات کا نام دیتے، ان کا موقف تھا کہ تصوف ذات سے بے بہرہ ہونے کا نام نہیں بلکہ معرفت ذات کا نام ہے، گو بعض اوقات سالک کو اس کے ذوق اور وجدان کے مطابق ذاتِ خداوندی میں ایسی نسبت حاصل ہوجاتی ہے جس میں ہر وقت ترقی ہوتی رہتی ہے، لیکن انسانی محدودیت خدائے لم یزل کی لامحدودیت کے سامنے بے بس ہوکر عظمت کے سامنے قرار نہیں رکھ سکتی اور نتیجہ کے طور پر فنا ہوجاتی ہے لیکن اس فنائیت میں بے خودی لازمی نہیں ہوتی اور جس میں بے خودی ہوتی ہے وہ غیبت ہے، اسکو فنا نہیں کہتے۔[۱]

معرفت الٰہی

مولانارومیؒ دراصل عالم اسلام کا بغور مطالعہ ومشاہدہ کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے، کہ امت کا علم جب تک عمل سے متصف نہیں ہوگا حقیقت کا سراغ نہیں مل سکتا۔ استدلال وقیاس اور تعقل پسندی کے زور پر اذعان و یقین ہر گز حاصل نہیں ہوسکتا جب تک کہ خلوص وتقویٰ اور للّٰہیت کے جذبات ساتھ نہیں ہوں گے، اُن کا موقف تھا کہ علم جب تک دل پر اثر انداز نہ ہو، وہ کارگر ثابت نہیں ہوتا، فرماتے ہیں۔ ؎

علم چوں بردل زند یارے شود علم چوں بر تن زند مارے شود

اسم خواندی رومسمی رابجو مہ ببالادان نہ اندر آب جو

خویش ر اصافی کن از اوصاف خود تا ببینی ذات پاک صاف خود[۲]

یعنی قلبی علم آپ کا دوست بن جائے گا اور تن پروری والا علم آپ کے لیے سانپ بنے گا،جب تم کو اسم کا تعارف ہوگیا ہے تو اب مسمی کو تلاش کرنے میں لگ جاؤ، چاند کو آسمان پر ہی سمجھو، کہیں پانی پر اس کا عکس دیکھ کر پانی میں تلاش نہ کرنے لگ جاؤ، اگر تم اپنے آپ کو صاف کرنے میں کامیاب ہوگئے تو تم کو اپنی ذات میں صفائی اور

اجلا پن دکھائی دے گا، مولانا رومؒ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ذات کی اس طہارت اور صفائی کا اتصال اپنے دریائے معرفت و رحمت سے کر دے، فرماتے ہیں۔

قطرۂ دانش کہ بخشیدی زپیش متصل گرداں بہ
دریا ہائے خویش

کہ اے اللہ آپ نے اپنے کرم سے علم و دانش کا ایک قطرہ جو مجھے بخشا ہے اسے اپنے غیر محدود دریائے علم سے متصل فرمادیں۔

حضرت حکیم اختر مرحوم اس شعر کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ جسکے قطرہ علم کا اتصال حق تعالیٰ کے غیر محدود دریائے علم سے ہو گیا پھر سوچ لو کہ اسکا علم کیسا ہو گا، اسکا علم کبھی ختم نہ ہو گا، اس لیے اللہ والے علماء کے علم کو علماء ظاہر نہیں پاسکتے، جنکا قطرۂ علم کتب بینی سے متعلق ہے اور جنکا قطرۂ علم اللہ تعالیٰ کے دریائے غیر محدود سے متصل ہے۔ دونوں میں زمیں و آسمان کا فرق ہے۔[۳]

حضرت حکیم صاحب ایک اور مجلس میں رومی کو مزید نقل کرتے ہیں۔

خم کہ ازدریا در اور راہے شود پیش او جیحون
باز انوزند

یعنی جس مٹکے کو سمندر سے خفیہ رابطہ ہو جائے تو اس کے سامنے بڑے بڑے دریائے جیحون اور دریائے فرات زانوئے ادب تہہ کرتے ہیں، ان دریاؤں کا پانی خشک ہو سکتا ہے لیکن اس مٹکے کا پانی خشک نہیں ہو سکتا کیونکہ اس میں خفیہ راستے سے سمندر سے پانی آرہا ہے۔[۴]

حقیقی علم کے حصول کا ذریعہ کثرت معلومات اور کثرت کلیات نہیں بلکہ تزکیہ نفس ہے۔ حرص و ہوس اور اغراض کی کج بینی کے باعث آئینہ دل زنگ آلود ہو جاتا ہے اور حقیقت اس میں منعکس نہیں ہوتی۔ اس لیے حقیقت تک پہنچنے کا مرحلہ اول تزکیہ نفس ہے۔ ایک علم ابن الکتاب ہے اور دوسرا ام الکتاب، تزکیہ نفس سے انسان ام الکتاب بن کر ضروری علوم اس کے اندر سے اس طرح پھوٹیں گے جس طرح چشمے میں سے پانی نکلتا ہے۔ تزکیہ نفس سے معرفت حاصل ہونا منزل مقصود نہیں بلکہ اس پہچان کا مقصود خدا کا قرب و وصال ہے اور وصال کے لیے قرب کی کوشش اور کشش کا نام عشق ہے۔ پہلی منزل تزکیہ نفس ہے دوسری منزل علم و معرفت اور تیسری منزل عشق ہے اور وہ خدا ہے (وانّ الی ربک المنتھی)۔ اور یہی ارتقا کے مدارج ہیں۔

خود ز فلک برتریم و ز ملک افزونتریم زین
دو چرا نگذریم منزل ما کبریا است[۵]

ترجمہ: میں بذات خود آسماں سے بلند ہوں اور بادشاہ سے بہتر ہوں، میں نے ان دونوں چیزوں کو خیر باد کیوں کہا ہے، وہ اس لیے کہ میری منزل ذات کبریا تک رسائی ہے۔

اور سالک جوں جوں عشق میں ترقی کرتا ہے اس پر، اسرار وجود فاش ہو جاتے ہیں اور حکمت میں اضافہ لازمی ہو جاتا ہے۔ عارف رومی فرماتے ہیں کہ: ۔

علت عاشق ز علت ہا جدا است عشق اصطرلاب اسرار خدا است[۷]

ترجمہ: عشق کی بیماری دیگر بیماریوں سے الگ ہے، کیونکہ اصطرلاب سے محبت ہی اسرار خداوندی ہے۔ یعنی جس طرح ہیئت دان اصطرلاب استعمال کرتا ہے کہ ثوابت و سیارگان کے مقامات اور ان کی حرکتیں اس کو معلوم ہو سکیں اسی طرح عشق بھی اسرار خدا کا اصطرلاب ہے۔

شریعت و طریقت کی راہ پر رومیؒ طلب و عمل کا پیغامبر ہے، اس لیے صادقین کے لیے رومی قونیہ کے قبرستان میں نہیں بلکہ سالک کے سینے میں رہتا ہے۔

مولوی جلال الدین رومیؒ کی قبر پر ایک شعر کندہ ہے، جو بجا طور پر ایک حقیقت کی حیثیت رکھتا ہے کہ۔

بعد از وفات تربت ما در زمینے مجوئے در سینہ ہائے مردم عارف مزار ماست

یعنی میری وفات کے بعد زمین میں میری قبر مت ڈھونڈھو، بلکہ میرا مزار اہل معرفت کے سینوں میں ملے گا.

شریعت و طریقت

عارف رومی نے اُس عہد میں بڑی قوت سے شریعت، طریقت اور حقیقت کی حیثیت کو واضح کیا اور اس ضمن میں غلط تعبیرات کا ازالہ فرمایا، دفتر پنجم کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

''شریعت ہمچوں شمعے است کہ راہ می نماید، چوں در راہ آمدی، ایں رفتن تو طریقت است، وچوں مقصود رسیدی آں حقیقت است۔ حاصل آنکہ شریعت ہمچوں علم کیمیا آموختن است از استاد یا از کتاب، وطریقت استعمال کردن داروہا ومس را در کیمیا مالیدن، و حقیقت زر شدن مس، یا مثال شریعت ہمچوں علم طب

آموختن است و طریقت پرہیزکردن بموجب علم طب ودار وخوردن و حقیقت صحت یا فتن"۔[7]

یعنی شریعت شمع کی طرح ہے جو راہ دکھاتی ہے، جب راہ پر چلنا شروع کر دیا جائے تو یہ طریقت اور جب منزل و مقصود تک پہنچ لیا جائے تو یہ حقیقت ہے، حاصل یہ کہ شریعت ایسے ہی ہے جیسے کسی استاد یا کتاب سے کیمیا گری کا طریقہ سیکھ لیا جائے اور طریقت ایسے ہی ہے جیسے ادویہ اور چاندی لوہے وغیرہ کو کیمیا میں ملانا جبکہ لوہے وغیرہ کا سونا بن جانا حقیقت ہے، یا مثلاً ایک شخص نے علم طب پڑھا، یہ شریعت ہے، دوا استعمال کی یہ طریقت ہے، مرض سے افاقہ ہو گیا یہ حقیقت ہے، غرض یہ کہشریعت علم ہے، طریقت عمل ہے جبکہ اُس عمل کا اثر حقیقت ہے۔ مولانا شبلی نعمانی اس اجمال کی تفصیل کرتے ہوئے شریعت کو چار چیزوں پر منحصر کرتے ہیں، (۱) اقرار زبانی (۲) اعتقاد قلبی (۳) تزکیہ اخلاق (۴) اعمال یعنی امر و نواہی۔

اعتقاد تین طریقوں سے پیدا ہوتا ہے: تقلید سے، استدلال سے، کشف و حال سے. پہلی دونوں قسموں کو شریعت کہتے ہیں، یعنی ان طریقوں سے کسی کو اگر اعتقاد حاصل ہو تو کہا جائیگا کہ اسکو شرعی اعتقاد حاصل ہے۔ تیسری قسم کا اعتقاد طریقت ہے، یہ قسم بھی شریعت سے باہر نہیں، لیکن امتیازاً ایک خاص نام رکھ لیا گیا ہے، کیونکہ یہ اعتقاد سلوک و تصوف اور مجاہدہ و ریاضت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔

اسی طرح تزکیہ اخلاق کے جو احکام، شریعت میں مذکور ہیں ان کا نام شریعت ہے، لیکن محض احکام کے جاننے سے تزکیہ اخلاق نہیں ہوتا، علماء ظاہر اخلاق کی حقیقت و ماہیت سے بخوبی واقف ہوتے ہیں لیکن خود ان کے اخلاق پاک نہیں ہوتے، یہ مرتبہ مجاہدات اور فنائے نفس سے حاصل ہوتا ہے اور اسی کا نام طریقت ہے، تعمیل فرائض اور اجتناب منہیات کا بھی یہی حال ہے۔[8]

مولانا رومؒ نے سلوک و تصوف کے میدان میں تمام نام نہاد متصوفین کو گویا یہ چیلنج کیا کہ شریعت اور طریقت دو متضاد چیزیں نہیں بلکہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں. مولانا تفسیر، فقہ اور دیگر علوم عالیہ کو روحانی مدارج و مراتب کے حصول کے لیے ضروری گردانتے لیکن طریقت و تصوف کو بھی کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کی عملی تشریح سمجھتے تھے، یہ تعبیر بعینہ وہی ہے جو امام مالکؒ نے تصوف اور فقہ کے باہمی تلازم کے حوالے سے ذکر فرمائی کہ:

من تفقہ ولم یتصوف فقد تفسق، ومن تصوف ولم یتفقہ فقد تزندق، ومن جمع بینہما فقد تحقق[9]

یعنی جس نے فقہ حاصل کیا اور صوفی نہ ہوا وہ فاسق ہوا۔ اور جو صوفی تو ہوا لیکن فقہ کو حاصل نہ کیا وہ زندیق ہوا، اور جس نے دونوں کو جمع کیا وہ بلاشبہ محقق ہوا۔

عارف رومی بلاشبہ ان صوفیا کے سرخیل تھے جنہوں نے علم و شریعت اور زہد و طریقت کے اس رشتہ کی مضبوطی میں اہم کردار ادا کیا۔

عمل کی ترغیب

مقامات سلوک میں سے "توکل" کی توضیح کرتے ہوئے رومیؒ نے اس کو جہد و سعی کا متبادل قرار نہیں دیا بلکہ توکل کو عمل سے ملزوم قرار دیا ہے، وہ فرماتے ہیں:۔

گفت پیغمبر بآ واز بلند   باتوکل زانوئے اشتر بہ بند[10]

ترجمہ: پیغمبر نے بہ آواز بلند فرمایا تھا کہ اونٹ کو باندھ کر توکل کرو

وہ صوفیوں اور فقیروں کو بھی حرکت و عمل کی تلقین کرتے ہیں، ان کا مذہب ہے کہ کرامات و خوارق کے اعتماد پر عمل کی راہ سے انحراف و بیزاری کے ذریعے وہ کوئی خزینہ معرفت حاصل نہیں کر سکتے اور نہ ہی ان کی یہ فکر ثمر آور ہو سکتی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:۔

کاں فلانے یافت گنجے ناگہاں   من ہم آن خواہم چراجویم دکاں

کسب کردن گنج رامانع کیست   پامکش ازکار آن خوددرپیست[11]

مولانا رومؒ اُن صوفیوں کو آڑے ہاتھوں لیتے ہیں جو لوگوں کو توکل بمعنی بے عملی اور گوشہ نشینی کا درس دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ نابکار لوگوں نے تصوف کو بدنام کر رکھا ہے:۔

ہست صوفی آں کہ شد صفوت طلب   نہ از لباس صوف و خیاطی و دب

صوفی گشتہ بہ پیش ایں لیام الخیاطہ واللواطہ والسلام

ایسی صورت میں مولوی جلال الدین رومیؒ طریق تصوف میں طلب اور عمل، حرکت اور سوز و ساز عشق اور حرارت کا درس دیتے ہیں، بنا طلب ماں دودھ بھی نہیں پلاتی اور بچے کا رونا اسکی طلب ہے، اسی طرح سالک کے لیے طلب صادق کا ہونا بھی لازمی ہے۔

عموماً متصوفین کی خانقاہوں میں یہ تاثر پروان چڑھ رہا تھا کہ فلاں بزرگ صرف اپنی ایک نظر میں کامل کر دے گا، جس کے نتیجہ میں بے طلبی اور بے عملی بڑھنے لگی اور تصوف زنادقہ کے ہاتھوں میں آنے لگا۔ عہد حاضر میں بھی اسطرح کے خیالات پائے جاتے ہیں، مولانا رومیؒ کا یقیناً یہ امتیازی کارنامہ ہے کہ انہوں نے طلب و عمل کی ضرورت واہمیت کو مؤثر انداز سے واضح کیا، فرماتے ہیں:

کیں طلب گاری مبارک جنبشے است ایں طلب در
راہ حق مانع کشے است
ایں طلب مفتاح مطلوبات تست ایں سپاہ و نصرتِ
رایات تست[۱۲]

محبت کا درس

انسانی تاریخ میں صوفیہ کی پہلی جماعت ہے جس نے انسانی حقوق کے تقدس کا نعرہ بلند کیا اور دل آزاری کو سب سے بڑا گناہ قرار دیا، احترام آدمیت ہر صوفی کا مذہب ہے، اسی لیے مولانا رومؒ کہتے ہیں:

دل بدست آور کہ حج اکبر است کعبہ بنگاہ
خلیل آذر است
از ہزاران کعبہ یک دل بہتر است دل
گذرگاہ جلیل اکبر است[۱۳]

دل کو ہاتھوں میں لے لیں کہ یہ حج اکبر ہے... ہزار کعبوں سے ایک دل بہتر ہے کیونکہ دل اللہ تعالیٰ کی بڑی گزر گاہ ہے۔

رومی اس حقیقت سے بالکلیہ واقف تھے کہ "اکثر عقائد اور دعاوی میں کچھ نہ کچھ حقیقت کا شائبہ ہوتا ہے اور بطلان افراط و تفریط سے پیدا ہوتا ہے یا کسی جز کو کل سمجھ لینے سے یا ایسے نتائج اخذ کرنے سے جو حقیقتاً اس عقیدے سے مستنبط نہیں ہوتے۔"[۱۴]

اس بحث سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ مولانا رومؒ اپنے مذہب (اسلام) کے حوالے مداہنت برتتے تھے بلکہ مقصود صرف یہ ہے کہ مختلف مذاہب و مسالک میں اقدار مشترکہ کی بناء پر دنیا میں اتحاد اور اتفاق کی صورتیں

پیدا کی جاسکتی ہیں، چنانچہ اسلام کے ابتدائی عہد میں نجران کے عیسائیوں سے جس رواداری کا مظاہرہ آپ ﷺ نے فرمایا وہ قابل تقلید ہے. اسی طرح تذکروں میں ملتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایلیا فلسطین میں خود اپنے ہاتھوں سے ہیکل کو صاف کیا اور اسکی گرد و غبار کو ہٹایا، اس عمل میں آپؓ کے ساتھی بھی شریک ہوگئے، اسی روایت میں یہ بھی ملتا ہے کہ اس دوران نماز کا وقت آگیا اور آپؓ نے ہیکل سے باہر نماز ادا کی، جس پر استفسار ہوا کہ آپکا ایک عمل تو ہیکل کو خود صاف کر کے رواداری کے اظہار کا ہے جبکہ دوسرا گویا اُن سے علیحدگی اور بیزاری کا ہے، اسکی کیا وجہ ہے؟ تو آپؓ نے یہ تاریخی جواب دیا کہ میں نے اس لیے ہیکل میں نماز نہیں پڑھی کہ کہیں کل مسلمان قوم اس بناء پر کہ ان کے خلیفہ نے اس میں نماز پڑھی، ہیکل کو گرا کر مسجد نہ بناڈالیں۔

لایعنی بحثوں سے اجتناب

ظاہری الفاظ میں الجھ کر طویل اور لایعنی مباحث کا دروازہ کھولنا یا باطنی تاویلات، دوراز کار مبالغہ آرائی سے مسائل میں اغماض پیدا کرنا امت کے مزاج اور وقت کے تقاضوں کے یکسر خلاف ہے، ان کی نظر میں مذہبی فرقہ بندیوں کی تشکیل و ترویج کے بھی بنیادی طور پر یہی دو اسباب ہیں:

ا۔ ظاہری نصوص و عبارات میں لایعنی مباحث

۲۔ باطنی تاویلات اور اس میں مبالغہ آرائی

اسی لیے محقق رومیؒ نے فرقہ بندیوں کی اس جنگ میں کسی ایک فریق کے طور پر کبھی شریک ہونا پسند نہیں کیا۔ وہ فرماتے ہیں:۔

من زقرآں برگذیدم مغزرا استخواں پیش سگاں انداختیم

میں قرآن سے مغز لے لیتا ہوں اور ہڈی کتوں کے لیے چھوڑ دیتا ہوں

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے وضاحت کرتے ہوئے رومی کے موقف کو اسطرح واضح کیا ہے:

لایعنی اور لاطائل مذہبی بحثیں تنگ نظری، تعصب اور حسد سے پیدا ہوتی ہیں، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ حسد تنگ نظری سے پیدا ہوتا ہے.... مولانا روم کی سوانح میں لکھا ہے[۱۵] کہ علماء خود بین و ظاہر پرست نے ان کے ساتھ حسد برتنا شروع کیا اور ایک شخص کو سکھا پڑھا کر مناظرے کے لیے ان کے پاس بھیجا کہ پہلے ان سے یہ سوال کرنا کہ آپ کس فرقے میں ہیں۔ پھر جس فرقے سے وہ اپنا تعلق بتائیں اس کے متعلق یہ سوال کرنا، کیونکہ ہر فرقہ کے متعلق مناظر کو الگ الگ پینترے اختیار کرنے پڑتے ہیں، چنانچہ اس نے مولانا سے آغاز بحث میں یہی سوال کیا؟ مولانا نے

جواب دیا کہ میں بہتر فرقوں سے متفق ہوں۔ یہ جواب جھگڑالو مولوی صاحب کے لیے بہت غیر متوقع تھا۔۔۔سٹ پٹا کر بولا کہ اسکا مطلب یہ ہے کہ آپ بے دین اور ملحد ہیں، مولانا نے فرمایا کہ میں اس سے بھی متفق ہوں۔""[۱۶]

نیز رومیؒ مسائل کے حل میں ایجابی رویہ اختیار کرنے کے قائل تھے یعنی محض تنقید اور لفظی معرکہ آرائی سے اجتناب کرتے تھے، چنانچہ مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولوی رومؒ کے اس طرز کو یوں واضح کرتے ہیں:

وھو لایعرض کالفلاسفۃ والمتکلمین علی ان یعجز مخاطبہ بالدلائل الطویلۃ العریضۃ، والمقدمات المرصوفۃ المنسقۃ ویفخمھا، بل یحرص علی ان یقبلھا قلبہ کانہ شئی محقق، وکانہ یعبرعن خواطرہ وافکارہ، لذلک کانہ المثنوی العظیم مصدر ایمان جدید واذعان مزید فی کل عصر تنشرح بقرأتہ الصدور الحرجۃ، و تطمئن بدراسۃ العقول المضطربۃ، ویجد فیہ کثیرمن القراء حلا لمعضلاتھم، و شفاءً لداءھم، وھومن ھذہ الناحیۃ مؤسس علم جدید واذا کان لابد من مصطلح الفلسفۃ فھو مؤسس فلسفۃ جدیدۃ، وھوفی ذلک امام مجتھد من أئمۃ الکلام، لایقلد ولایتبع الا القرآن الحکیم ولا یستوحی الا فطرتہ السلیمۃ[۱۷]

یعنی مولانا کا خاص طرز یہ ہے کہ وہ دماغ کو شکست دینے کی اور مخاطب کولاجواب کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اپنی بات کو اس خوشی اور رضامندی سے دل میں بٹھانے اور ذہن میں اتارنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مخاطب کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ بات پہلے سے اسکے دل میں تھی اور مولانا نے اسکی ترجمانی کی ہے، اس طرز کلام کا نتیجہ یہ ہے کہ مثنوی سے دینی اصول و عقائد اور متکلمانہ مسائل و مباحث کے بارے میں ایسا اذعان، شرح صدر اور اطمینان قلب پیدا ہوتا ہے جو علم کلام کے پورے کتب خانے سے نہیں پیدا ہوتا، اسکے ساتھ ساتھ ایک ذوق و سرور بھی پیدا ہوتا ہے جو ایک صاحب یقین اور صاحب عشق ہی کے کلام سے پیدا ہو سکتا ہے۔۔۔ان کی روش عام متکلمین اور علماءِ عقائد سے بالکل علیحدہ ہے اور نسبتاً قرآن مجید کے طرز استدلال اور فطرت سلیمہ سے زیادہ قریب ہے۔[۱۸]

رومی کا دور مناظروں اور مباحثوں کا دور تھا۔ فرقہ بندیوں اور مختلف کلامی آراء پر نزاعات اور تعصب کا زمانہ تھا، ایسے میں رومی علم و عمل کی شمع اور معرفت و تصوف کی روشنی لیکر پیغام رشد و ہدایت عطا کیا۔ انہوں نے بتایا کہ حقیقت دراصل ایک ہی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ مختلف لوگ اسے مختلف شکلوں میں پہچانتے اور مختلف ناموں سے پکارتے ہیں، اس نکتے کی وضاحت کے لیے رومیؒ نے ایک حکایت بیان کی ہے کہ:

اتفاق سے ایک ایرانی، ایک عرب، ایک ترک اور ایک یونانی ایک جگہ اکٹھے ہو گئے، وہ انگور کی خریداری پر آپس میں جھگڑ رہے تھے، خریدنا تو وہ سب انگور ہی چاہتے تھے لیکن انگور کے مختلف نام بتاتے تھے، ایرانی کہتا تھا کہ

انگور خریدیں، عرب کہتا تھا کہ نہیں عنب خریدنا چاہیے، ترک تجویز کرتا تھا کہ مجھے تو اوزم چاہیے، یونانی استافیلکی فرمائش کرتا تھا، اسی بات پر تکرار ہوگئی، حالانکہ سب ایک ہی چیز کے طالب تھے، وہ اپنی جہالت کی وجہ سے ناموں کا اختلاف معلوم نہ کرسکے اور مکہ بازی پر اتر آئے:::۔

در تنازع آں نفر جنگی شدند   کہ ز سرنامہا غافل بدند

مشت برہم میزدند از ابلہی   پربدند از جہل و از دانش تہی[19]

ترجمہ: ان لوگوں نے اس تنازع میں ہاتھاپائی شروع کی، کیونکہ وہ ناموں کے راز سے بے خبر تھے، جہالت اور بے وقوفی سے ایک دوسرے سے مشت و گریبان ہوگئے، یہ اس لیے کہ یہ لوگ عقل و دانش سے خالی تھے۔ گویا عارف رومیؒ نے مسائل میں اختلاف اور تفرقہ کی اصل وجہ جہالت اور ناواقفیت کو قرار دیا اور اُس کے حل کے لیے یہ تجویز دی کہ وہ کسی امین یا علم وحکمت کے بادشاہ، مرشد حقیقت داں کا دامن پکڑلیں... وہ فرماتے ہیں:

از نزاع ترک و رومی و عرب   حل نہ شد اشکال انگور و عنب

تا سیلمان امین معنوید   رنیایدبرنخیز د ایں دوئی[20]

ترجمہ: ترکی، رومی اور عربی کے انگور و عنب والا مسئلہ اس وقت تک حل نہ ہو سکا جب تک ان کے درمیان ایک امین اور صاحب حکمت دانانے ثالثی کا کردار ادا نہیں کیا۔

ایک اور مقام پر مولوی رومیؒ حقیقت کا موازنہ ایک ایسے ہاتھی سے کرتے ہیں جو ایک تاریک کمرے میں بند ہے۔ ایک شخص نے اسے اپنے ہاتھ سے ٹٹولا، اسکا ہاتھ ہاتھی کی سونڈ پر پڑا، وہ سمجھا کہ ہاتھی ایک پرنالے کی مانند ہے، دوسرے کا ہاتھ اسکے کان پر پڑا اُس نے ہاتھی کو ایک پنکھے جیسا خیال کیا، تیسرے نے جو اسکی ٹانگ ٹٹولی تو اسے ایک ستون تصور کیا، چوتھے نے اسکی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا تو سمجھا کہ ہاتھی ایک تخت کی طرح ہموار ہوتا ہے۔ مولانا رومیؒ کہتے ہیں کہ اگر اُن لوگوں کے ہاتھ میں ایک شمع ہوتی تو ان کے بیانات میں یہ اختلاف پیدا نہ ہوتا:۔

درکفِ ہرکس اگر شمعے بدے   اختلاف ازگفت شاں بیروں شدے[21]

ترجمہ: اگر ہر شخص کے ہاتھ میں چراغ دی جائے تو وہ ان اختلافات سے باہر نکل آسکتا ہے۔

جعلی اور جہلاء صوفیاء